پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد

انسان اور معاشرہ ـــــــــ اقبال کی نظر میں!

کرۂ ارض پر انسان کے ظہور پذیر ہونے کے بارے میں ہمیں دو قسم کی تشریحات ملتی ہیں۔ایک سائنسی اور دوسری مذہبی۔آج سے تقریباً ساڑھے چار بلین سال پہلے مختلف گیسوں اور منتشر ذرّاتِ خاک کے بھنور سے کرۂ ارض نمودار ہوا۔اس وقت یہ آگ کا ایک دہکتا ہوا گولا تھا۔سورج کے گرد مدار پکڑ کر یہ کئی زمانوں تک گھومتا رہا حتیٰ کہ اس کی بیرونی سطح ٹھنڈی اور معتدل ہوگئی۔(۱) ماہرین اور محققین ہمیں بتاتے ہیں کہ آج سے ساٹھ کروڑ سال پہلے زمین پر بڑی چھوٹی چٹانوں کی تشکیل ہو چکی تھی۔زمین پر جو بھی تبدیلیاں رونما ہوتیں انکے نقوش ان چٹانوں پر ثبت ہو جاتے۔پتے، درخت، جھاڑیاں، جانوروں کے ڈھانچے ان چٹانوں پر پڑے پڑے خود تو گل سڑ جاتے تھے لیکن پتھر کے ایسے نقوش چھوڑ جاتے تھے جو چٹانوں کا حصہ بن کر لاکھوں کروڑوں سالوں تک کے لئے محفوظ ہو جاتے تھے۔انہیں ماہرین پتھریلے نقوش یا متحجّر آثار (Fossils) کا نام دیتے ہیں۔چنانچہ چٹانوں کی عمر کا اندازہ لگا کر ان متحجّر آثار کی طوالت اور اس زمانے کے کوائف کے بارے میں اندازے لگائے جاتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ساٹھ (60) کروڑ سے چھتیس (36) کروڑ سال پہلے کے دور میں ان چٹانوں پر آثار حیات مفقود ہیں۔چھتیس (36) کروڑ سال سے چھبیس (26) کروڑ سال پہلے کے دورانیہ میں بڑی بڑی آبی مخلوقات کی موجودگی کا پتہ چلا ہے۔چودہ (14) کروڑ سال پہلے کی چٹانیں پانی میں تیرتی مچھلیوں، مینڈکوں اور مختلف نباتات کا پتہ دیتی ہیں۔چودہ (14) کروڑ سال کے بعد کا دور پیٹ کے بل رینگنے والے جانوروں اور کچھوؤں کی ٹانگیں رکھنے والی مخلوقات کا سراغ دیتا ہے۔چار (4) کروڑ سے لے کر ایک کروڑ سال پہلے کی چٹانیں

بے شمار دودھ پلانے والے جانوروں، مختلف قسم کے چوپایوں اور انواع و اقسام کے درختوں کی کہانی سناتی ہیں۔ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوان مثلاً ڈائنوسار اور میمتھ وغیرہ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ آج متعدّد جانوروں کی نسلیں عنقا ہو گئی ہیں اور بے شمار ایسی ہیں جو تھوڑے بہت عضویاتی ردّوبدل کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ سائنسدان کو نباتی اور حیوانی حیات کے متحجّر آثار یعنی Fossils تو ملے ہیں جن سے انہوں نے زمانہ ماقبل تاریخ کی ایک پوری نیچرل ہسٹری مدوّن کر لی ہے لیکن انہیں کوئی ایسے آثار نہیں ملے جن سے انسان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہو۔ انہیں جو Fossils دستیاب ہوئے ان سے جہاں متعدّد حیوانات کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں کئی قسم کے بندر، لنگور، بن مانس، میمون (Apes) اور دیگر حیوانات بھی موجود تھے جو انسان سے مشابہت رکھتے تھے لیکن انسانوں سے بہرحال مختلف تھے۔ اسی سطحی مشابہت سے ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نوعِ انسانی انہی کمتر درجے کے جانوروں سے ارتقاء پذیر ہوئی ہے۔ اپنی کتاب ''اصل الانواع'' (Origion of Species) میں اس نے یہ موقف پیش کیا ہے کہ حیات کسی گرم مرطوب دلدلی خطّے سے یکلخت نمودار ہوئی اور مختلف انواع میں تبدیل اور ارتقاء پذیر ہوتی ہوئی بالآخر نوعِ انسانی پر منتج ہوئی۔ ماحول سے مطابقت (Adaptation to the Enviornment) کا محرّک زندگی کو مسلسل جادۂ ارتقاء پر آگے دھکیلتا رہا اور انواع کی ساخت و ہیئت میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہا۔ ڈارون کے زمانے میں طبیعیات، کیمیا اور دیگر اثباتی علوم نے ہر جگہ اپنی فتح و نصرت کے پرچم گاڑ رکھے تھے۔ جب ڈارون نے اثباتی علوم کے میکانکی قوانین کا اطلاق حیاتیاتی ارتقاء پر کر کے کہا کہ انسان فطری انتخاب (Natural Selection) بقائے اصلح (Survival of the Fittest) اور ماحول سے مطابقت جیسے قوانین کے تحت کمتر انواع سے ارتقاء پذیر ہوا ہے تو اسے خالصتہً سائنسی تعبیر سمجھا گیا اور ہر جگہ اس کی پذیرائی کی گئی لیکن جلد ہی سائنسدانوں اور Fossils کے ماہرین نے اس طلسم کا پردہ چاک کر دیا اور ڈارون کے نظریہ کی سائنسی حیثیت ختم ہو گئی۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر کئی طرح سے تنقید کی گئی ہے لیکن دو بڑے اعتراض اسکی تردید کے لئے کافی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ایک نوع ارتقاء پذیر ہو کر دوسری نوع میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ایک نوع کے افراد میں ماحول، موسم اور طرز بود و باش کی تبدیلیوں کی وجہ سے معمولی عضویاتی تبدیلیاں اور رنگ و روپ اور عادات و مزاج کے خفیف سے تغیّرات تو ضرور وقوع پذیر ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی اساسی نوعی ہیّت غیر متبدّل رہتی ہے۔ مثلاً برفانی علاقوں کے رہنے والے جانور یا انسان صحرائی علاقوں کے جانوروں اور انسانوں سے ظاہری شکل و شباہت اور عادات و مزاج کے اعتبار سے قدرے مختلف ہو سکتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے رہنے والے استوائی جنگلوں کے باسیوں سے تھوڑے بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔ مگر ماحول سے مطابقت کی بنا پر کوئی بھی ذی حیات اپنی نوع کی سرحدیں عبور کر کے کسی دوسری نوع میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ نوعی اور عضویاتی اعتبار سے آج کا انسان ویسا ہی ہے جیسے ہزاروں سال پہلے کا انسان تھا۔ وہ صلاحیتیں جو قدیم انسان میں بالقوۃ (Potentially) موجود تھیں، تجربے، مشاہدے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بالفعل (Actually) ظہور پذیر ہوتی رہیں۔ بیج کے اندر پورا درخت اپنے برگ و بار سمیت بالقوۃ موجود ہوتا ہے۔ مناسب ماحول اور دیکھ بھال کی وجہ سے وہ ایک دن بالفعل شجرِ سایہ دار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح قدیم انسان بھی مختلف تاریخی ادوار سے گزرتا ہوا اپنی باطنی قوتوں سے روشناس ہوتا گیا اور جدید انسان کی صورت اختیار کر گیا۔ ارتقاء کا عمل ان معنوں میں جاری و ساری ہے نہ کہ ایک نوع کی سرحدیں توڑ کر دوسری نوع کی شکل میں ظاہر ہونا ہے۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ارتقائی عمل سے نوعی ہیئت اور عضویاتی ساخت میں تبدیلیاں آتی ہیں تو بندروں، میمونوں اور بن مانسوں کے کئی گروہ ہمیں اس عمل سے گزرتے نظر آتے اور ان میں متعدد ایسے ہوتے جو منصبِ انسانیت سے چند گام ہی دور ہوتے۔ ماضی کے پچاس ہزار سالوں کی پوری تاریخ میں ہمیں کوئی ایسے شواہد نہیں ملتے کہ کوئی بندر یا بن مانس انسان کی جون میں نمودار ہوا ہو۔ بن مانس، بن مانس ہی تھا اور رہے گا اور انسان، انسان ہی تھا اور رہے گا خواہ وہ قدیم ہو یا جدید۔ ہر ذی روح اپنی نوع کے اندر ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی کے اندر مرتا ہے۔ ایک نوع کا نر دوسری نوع کی مادہ سے جنسی اختلاط نہیں کر سکتا۔ البتہ بعض اوقات دو انتہائی قریبی اور مماثل انواع کے نر اور مادہ جنسی تعلق قائم کر لیتے ہیں، تو اولاً انکی اولاد جنم نہیں لیتی اور اگر انکا کوئی بچہ پیدا ہو بھی جائے تو وہ آگے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا

ہے۔گدھے اور گھوڑی کے اختلاط سے انکا بچہ تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ خچر ہوتا ہے جو توالد و تناسل کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔

زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟ مختلف انواع کیسے کیسے معرض وجود میں آئیں؟ نوع انسانی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے تسلی بخش جواب نہیں دیئے جا سکتے۔البتہ نظری بحثیں جتنی بھی کر لی جائیں کم ہیں۔اگر خالصتہً سائنسی تحقیق اور تاریخی شواہد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان اور اسکے ابتدائی زمانے کی تصویر کچھ اس طرح کی تیار ہوتی ہے۔

آج سے پچاس ہزار سال پہلے مٹی اور پانی کے آمیزے یا کسی دلدلی خطےّ میں انسان کی آفرینش ایک پُراسرار اور نا قابل فہم انداز میں ہوئی۔اس کے پاس نہ درندوں جیسے ناخن تھے اور نہ ہی نوکیلے دانت۔خونخوار درندوں اور زہریلے سانپوں سے بچنے کیلئے اس نے محفوظ پناہ گاہیں تلاش کی ہوں گی۔قدرتی نباتات،خودرو پھلوں اور سبزیوں، بیجوں اور دانوں وغیرہ سے پیٹ بھرتا ہوگا۔رہنے کیلئے اس نے ایسے علاقے منتخب کیے تھے جہاں نہ زیادہ سردی تھی اور نہ زیادہ گرمی۔اسکا پہلا ہتھیار لکڑی کا ڈنڈا تھا۔پھر اس نے چقماق پتھر کو تراش کر نوک دار بھالے اور تیز دھار کلہاڑے وغیرہ بنالیئے۔یہ چقماق پتھر پچاس ہزار سال پرانا ہے۔جدید دور میں کھدائی کے دوران یہ ہتھیار اور اوزار زمین کی تہوں سے برآمد ہوئے ہیں۔اس دور کے انسان کی یہی ایک نشانی ایسی ہے جو اسکے ہاتھوں کی کرشمہ سازی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور ان ہتھیاروں اور اوزاروں کو دنیا کے بڑے بڑے عجائب گھروں کی زینت بنایا گیا ہے۔ماہرین اور محقّقین نے اس دور کے انسان کے بارے میں جو قیاسات قائم کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(1) درختوں کے پتّوں اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے حصّہءِ اسفل کو ڈھانپنا۔(2) کم کم بولنا اور چیزوں کے نام رکھنا۔(3) لکڑی کے ڈنڈوں اور بعدازاں پتھر کے تیز دھار کلہاڑوں اور نوکدار بھالوں کا استعمال کرنا جو نہ صرف دفاع کے کام آتے تھے بلکہ شکار کرنے میں بھی موثر اور کارآمد ثابت ہوتے تھے۔(4) مُردوں کو دفن کرنا۔(5) آگ کی خصوصیات کا جائزہ لینا جو جنگلوں کی قدرتی آگ اور آتش فشاں پہاڑوں کی آگ کی صورت

میں پہلے سے موجود تھی۔(6) پھولوں، خوشنما پتوں، چمکیلے سنگ ریزوں اور (سمندر کے کنارے پہنچنے کے بعد) سیپوں اور گھونگوں کو آرائش کے طور پر پہننا۔(۲)

انسان کا بالکل ابتدائی دور بے شعوری کی حالت میں گزرا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی باطنی قوتیں بیدار ہوتی گئیں اور وہ تجربے، عقل اور مشاہدے سے سیکھتا ہوا بہتر سے بہتر اندازِ زندگی اختیار کرتا ہوا ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگا۔ زبان استعمال کرنے کی صلاحیت کو فروغ ملا اور اسکی ابلاغ کی قوت بہت بڑھ گئی۔ اس طرح زمانہ قدیم کا کمزور اور لاچار انسان اپنی ہی عقل و شعور اور تجربہ و مشاہدہ کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہوا دیگر مخلوقات اور اپنے ماحول پر غلبہ و تصرّف حاصل کرتا گیا۔

☆☆☆

انسان کی تخلیق کی دوسری تشریح مذہب فراہم کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد جگہوں پر انسان کی تخلیق کا ذکر آیا ہے۔ قرآن حکیم نے اس مواد کے لئے جس سے انسان کی تخلیق کی گئی لفظ ''طین'' یعنی مٹی استعمال کیا ہے۔ ''وہی ہے جس نے تمہیں ''طین'' یعنی مٹی سے پیدا کیا''۔ الانعام (6:2)۔ پھر فرمایا گیا ''اللہ کے لیے عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ جیسی ہے جسے اس نے ''تراب'' یعنی مٹی سے پیدا کیا۔'' آل عمران (3:59) ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا ''میرا یہ کام نہیں کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے صلصَالٍ مِن حَمَاٍ مَسنُون'' سے پیدا کیا ہے''۔ الحجر (15:33) سورہ رحمٰن میں کہا گیا کہ ''اسی نے انسان کو ٹھکیری کی طرح کھنکھناتی مٹی ''صلصالٍ کالفخّار'' سے پیدا کیا۔'' الرحمٰن (55:14) یہ اور اس طرح کی دیگر آیات (۳) اس امر کی طرف واضح طور اشارہ کرتی ہیں کہ انسان کا خمیر کرۂ ارض کے عناصر بالخصوص مٹی اور پانی سے ہی اٹھایا گیا ہے اور جب اس کا پیکر خاکی تیار ہو گیا تو اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اسطرح یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی تخلیق میں عناصرِ ارضی کے ساتھ ساتھ اُلوہیت کا عنصر بھی شامل ہے۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ آدم کے علاوہ ''بشر'' اور ''انسان'' کے الفاظ بھی اس کی تخلیق کے حوالے سے استعمال کیے گئے ہیں جن سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں بلکہ پوری ''نوعِ انسانی'' ہے۔ ایک مقام پر فرمایا گیا ''وہی ہے جس نے

تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اسکا جوڑا بنایا'' اس آیت سے بعض مفسرین نے ''نفسٍ واحدۃ'' سے مراد حضرت آدمؑ لی ہے۔لیکن فخرالدین رازی اور اکثر آئمہ نے اسے ''عام انسان'' پر محمول کیا ہے۔(۴) علامہ اقبال بھی اسی خیال کے حامی ہیں کہ آدمؑ سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک تصوّر کی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی روایت میں بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مقصد کے لئے تخلیق کیا اور فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔فرشتوں نے استفسار کیا کہ کیا آپ اسے خلیفہ بنائیں گے جو زمین پر فساد اور خون خرابہ کرے گا۔اللہ نے آدمؑ کو اشیاء کے نام سکھا دیئے اور فرشتوں سے کہا کہ ان اشیاء کے نام بتاؤ۔فرشتوں نے معذوری ظاہر کی۔پھر اللہ نے آدمؑ کو کہا تو اس نے اشیاء کے نام بتا دیئے۔اللہ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔پھر اُس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔اس نے انکار اور استکبار کیا اور راندۂ درگاہ ہوگیا۔پھر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ تنہائی دور کرنے کیلیئے ان کی دائیں پسلی سے حوّا کو خلق کیا۔اگرچہ حوّا کی تخلیق کا تذکرہ قرآن حکیم میں نہیں ملتا لیکن ثقہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے انہیں آدمؑ کی پسلی سے خلق کیا تھا۔آدمؑ اور حوّا جنت میں رہنے لگے۔مگر ان پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ شجرِ ممنوعہ کے قریب نہ جائیں۔ابلیس جو کہ ان کا دشمن تھا انہیں ورغلانے میں کامیاب ہوگیا۔انہوں نے حکم خداوندی کو بُھلا کر اس درخت کا پھل چکھ لیا۔اسی وقت ان پر انکی برہنگی کھل گئی اور وہ جنت کے پتوں سے اپنا بدن ڈھانپنے لگے۔تب اللہ نے ان سب کو اسی وقت جنت سے نکال کر زمین پر اتار دیا۔لیکن پھر اللہ نے انہیں معاف کر دیا اور ان پہ چند کلمات القاء کیئے جن کے ورد سے ان کی توبہ قبول ہوئی اور وہ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے۔علامہ اقبال کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں جب کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے تو اسکا منشاء بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعہ کو بیان کیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسی آفاقی اور عالمگیر حقیقت کو تشبیہوں اور استعاروں میں پیش کیا جائے جو انسان کے فہم سے بالاتر ہوتا کہ اسکی اخلاقی اور روحانی حیثیت اجاگر ہو سکے۔علاّمہ لکھتے ہیں۔

''یوں بھی بہ حیثیت ایک ذی روح' انسان کی آفرینش کا جہاں کہیں بھی ذکر آیا ہے' قرآنِ پاک نے اس کے لیے 'بشر' اور 'انسان' کے الفاظ استعمال کیئے ہیں' آدم' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔لفظ آدم سے مقصود تو صرف یہ ظاہر کرنا

تھا کہ انسان کے اندر نیابت الٰہیہ کی صلاحیت موجود ہے ۔لہذا قرآنِ پاک نے وہ تمام اسمائے معرّ فہ حذف کر دیئے جو عہد نامہء عتیق کی اس روایت میں موجود ہیں۔آدم، حوا تا کہ اس کی نگاہیں جس حقیقت پر ہیں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا۔لیکن یہاں اسکا اشارہ مخصوص انسان کی طرف نہیں۔اس کی حیثیت ایک تصوّر کی ہے۔جس کی تائید قرآنِ پاک سے ہی ہو جاتی ہے اور جس، کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے۔'(۵)

"ولقد خلقنٰکم ثمَ صورنکُم ثم قُلْنَا لِلملٰئکۃ اِسجُدُوا لا دَمَ واسجَدُوٓا اِلَاّ اِبلِیس"
(11:7)

(ہم نے تمہاری تخلیق کی اور ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس حکم پر سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے)

متعدد مفسرّ ین ایسے ہیں جنہوں نے قصہّ ہبوطِ آدم کو تمثیلی اور استعاراتی قرار دیا ہے۔محمّد عبدہ کہتے ہیں کہ جنّت سے مراد آرام اور راحت کی جگہ لینا صحیح ہے یعنی یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں خوشی اور بے فکری کی کیفیت دائمی طور پر پائی جاتی ہے۔اسکی مثال ایسے ہے جیسے انسان کے بچپن کا زمانہ ہو جس میں نہ کوئی ذمہ داری ہوتی ہے اور نہ رنج سالم۔اسی طرح آدم سے مراد تمام نوع انسان لینا بھی درست ہے جیسے قبیلے کے باپ سے پورا قبیلہ مراد لی جاتی ہے۔عُریانی اور برہنگی برائیوں کا استعارہ ہے اور لباس کا مطلب ''تقویٰ'' ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جنّت میں رہنے اور اس سے خروج کا مفہوم یہ ہوا کہ انسانیت اپنے دورِ طفولیت سے نکل کر حدودِ شباب میں داخل ہوگئی ہے جہاں قدم قدم پر ذمہ داریاں اور مصاہب وشدائد کا سامنا بچپن سے جوانی تک کا سفر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے بعد بے شمار حالتوں کیفیتوں اور زمانوں سے گزرتا ہوا موجودہ دور تک پہنچا ہے۔(٦) اس ضمن میں علاّمہ اقبال کا بھی ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے جو کہ حسبِ ذیل ہے:

''قرآنِ مجید نے ہبوطِ آدم کا ذکر کیا ہے تو یہ بیان کرنے کے لیئے نہیں کرۂ ارض پر انسان کا ظہور کس طرح ہوا۔اس کے پیشِ نظر حیاتِ انسان کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلّی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لیئے شکاور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔مختصراً یہ کہ ہبوط

کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں، اس کا اشارہ اس تغیّر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعورِ ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا۔ وہ خوابِ فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت تو خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے۔ یوں بھی قرآنِ مجید میں یہ نہیں مذکور کہ کرۂ ارض ایک دار العذاب ہے جہاں انسان جس کا خمیر ہی بدی سے اٹھایا گیا ہے اور وہ کسی اولین گناہ کی پاداش میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ برعکس اس کے اسکی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے کیا اور یہی وجہ ہے کہ ارشادِ قرآن کے مطابق اس کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔ دراصل خیر میں جبر کا سوال ہی پیروی کرنا جس کا دارومدار پھر اس بات پر ہے کہ وہ ''انا'' جن کو اختیارِ ذات کی نعمت حاصل ہے، برضا و رغبت ایک دوسرے سے تعاون کریں اس لیئے کہ وہ ہستی جس کے اعمال و افعال کل کی طرح متعین ہیں، خیر کی اہل کیسے ہو سکتی ہے؟ آزادی، خیر کی شرطِ اولین ہے۔'' (۷)

☆☆☆

اب تک ہم نے مذہب اور سائنس کی تشریحات کا جائزہ لیا جو کہ انسان کی تخلیق کے بارے میں پیش کی گئیں۔ اگر مذہبی تشریح کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور اسکے مخفی مطالب کی پرتوں کو کھولا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس میں اور سائنسی تشریح میں کوئی بڑا تفاوت نہیں۔ مذہب میں عام آدمی کی تفہیم کے لئے تخلیقِ انسان کے معاملے کو تمثیلی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ کہ نہ مذہب اور نہ سائنس انسان کے اندازِ تخلیق کا کماحقہٗ ادراک کر سکتی ہے۔ البتہ نظریاتی بحثیں بہت کی جا سکتی ہیں۔ انسان کا معرضِ وجود میں آنا فطرت کا ایک سربستہ راز ہے اور قدرت کے دیگر لاتعداد اسرار کی طرح یہ بھی سرِ حد ادراک سے پرے ہے۔ ہمارے لیئے یہ سمجھنا ہی کافی ہے کہ انسان اس کرۂ ارض پر گزشتہ پچاس ہزار سال سے موجود ہے اور لاتعداد زمانوں اور ادوار و کیفیات سے گزرتا ہوا موجودہ مقام تک پہنچا ہی اسے کرۂ ارض پر اور فطرت کی قوتوں پر موثر غلبہ و تصرّف حاصل ہو گیا ہے۔

علاّمہ اقبال انسان کی تخلیق، اسکی نوعیت و ماہیت، اسیے امکانات اور اس کے بقائے دوام میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خودی کا نظریہ اُن کی فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان کے تصوّرِ خودی کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کیونکہ ان کا تصوّرِ خودی ان کے تصوّرِ حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔

ڈیکارٹ نے اپنے مشہور مقولے "Cogito Ergo Sum" ''یعنی میں سوچتا ہوں اس لیئے میں ہوں'' پیش کر کے فلسفے کی دنیا میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا تھا یعنی اپنے ہی شعوری تجربے کو فلسفیانہ تحقیق کا آغاز بنایا۔ اپنا شعوری تجربہ ایک ایسی ناقابل تردید حقیقت ہے جس پر کسی بھی صورت میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں آنے والے متعدّد فلاسفہ مثلاً لائبینز، برگساں، لاک وغیرہ نے ڈیکارٹ کی اس روایت کا اتباع کیا۔ علاّمہ اقبال بھی ایسی روایت کا اتباع کرتے ہیں اور اپنے شعوری تجربے کے تجزیہ اور تعبیر کو اپنے فلسفے کا نقطۂ آغاز بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان خارجی حقیقت کا ایک جزو ہے۔ اگر اس جزو کی کا اندازہ لگا لیا جائے تو کل کا پتہ لگانا مشکل کام نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی وارداتِ شعور کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ (۱) مادّہ (۲) حیات اور (۳) ذہن و شعور۔ یعنی یہ تین میدان ہی ہمارے شعوری تجربے کے دائرہ ہائے کار ہیں اور ہماری تمام علمی و تحقیقی کاوشیں ان تک ہی محدود ہیں۔ ان تینوں دائرہ ہائے کار علی الترتیب تین عقلی علوم یعنی طبعیات، حیاتیات، اور نفسیات سے تعرض کرتے ہیں۔ علامہ کا طریق یہ ہے کہ ان تینوں علوم کے نتائج کو یکجا کر کے ان کی تشریح و تعبیر کی جائے۔ اسطرح ان کے خیال میں ہمیں خارجی کائنات یا حقیقتِ مطلقہ کا سراغ مل سکتا ہے۔

علاّمہ نے اپنے لیکچرز میں مادّے کی نوعیت و ماہیّت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ارسطو کے زمانے سے عالم مادّی کے بارے میں یہ تصوّر چلا آ رہا تھا کہ یہ تکمیل شدہ مصنوع (Finished product) ہے جو کہ ایک خلائے محض کے اندر واقع ہے اسی طرح نیوٹن کا خیال تھا کہ خلائے بسیط (Empty space) کا وجود معروضی ہے اور مختلف ستارے اور سیّارے اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ خلا کی طرح زمان (Time) بھی معروضی حیثیت رکھتا ہے۔ عام خیال یہ بھی ہے کہ مکان یا فضائے بسیط معروضی ہے چاند اور زمین کے مابین جو فاصلہ ہے، اسے ہم معروضی خلا سمجھنے کی طرف مائل ہیں کیوں کہ اسے مختلف پیمانوں سے ناپا جا سکتا ہے۔ لیکن آئن سٹائن کے نزدیک یہ اضافی ہے اور زمین اور چاند کے وجود کا مرہونِ منّت ہے۔ اگر یہ دونوں کرّے معدوم

ہو جائیں تو ان کی درمیانی خلا بھی معدوم ہو جائے گی۔ علاّمہ لکھتے ہیں:

''زمان و مکان کے سانچے بھی فہم انسانی' اشیاء اور حوادث کو سمجھنے کے لیئے بناتا ہے۔ طبیعی سائنس کے مادّی' زمانی و مکانی تصوّرات نیوٹن کے نظریات سے استوار ہوئے تھے کچھ دور تک طبیعیات نے ان سے فائدہ اٹھایا' لیکن آخر میں سائنس خود اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گئی کہ نفس اور مادّے کی مصنوعی تقسیم کو ردّ کرے اور تمام نظریۂ کائنات پر از سرِ نو غور کرے کہ کیا مکان کوئی لامتناہی خلا ہے جس کے اندر اشیاء حرکت کرتی ہیں''۔ (۸)

آئن سٹائن کی طبیعیات کی رو سے عالمِ مادّی باہمدگر مربوط حوادث (Interrelated Events) کا نظام ہے اور یہ کہ زمان و مکان دونوں اضافی ہیں۔

حیاتیات میں برگساں نے انقلابی تصوّرات پیش کیے۔ وہ حیات کو حقیقت مطلقہ کہتا ہے جو ہر لحظہ ارتقاء پذیر ہے۔ لیکن یہ ارتقاء نہ تو نیچرل سلیکشن کا مرہونِ منت ہے نہ ہی (Adaption to the Environment) برگساں اپنی اصطلاح میں ایسے جوشِ حیات (Elan Vial) کہتا ہے جو ہر آن نئی سے نئی صورتیں بناتا آگے ہی آگے بڑھتا ہے جا رہا ہے۔ حیات میکانکی اور پہلے سے متعیّن نہیں بلکہ پہلے سے یہ' کہا جا سکتا کہ حیات اگلی شکل کونسی اختیار کرے گی۔ اپنے اس نظریہ کو وہ تخلیقی ارتقاء کا نام دیتا ہے اور ڈارون اور لامارک کی تشریحات کو یک قلم ردّ کر دیتا ہے۔ برگساں کہتا ہے کہ حیات کا تخلیقی ارتقاء اس پر جوش مصوّر کی طرح ہے جو وفورِ تخلیق میں کوئی شہکار تصویر بنانے میں مگن ہو اور اسے خود بھی علم نہ ہو وہ کیا تخلیق کرنے جا رہا ہے۔ برگساں کے نزدیک حیات حقیقتِ متلقہ ہے جو کہ ایسی حرکت ہے جسے ریاضیاتی زمانِ (Mathematical Time) نہیں کہا جا سکتا بلکہ حرکت محض یا دورانِ خالص (Pure Duration) کہا جا سکتا ہے جو جبریت اور میکانکیت سے کلیتاً پاک ہے۔

ہمارے تجربہ کا تیسرا درجہ شعور ہے۔ اس کے متعلق علاّمہ کا نظریہ درج ذیل ہے:

''شعور کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک انحراف (یا ایک سمت) ہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہے کہ زندگی کے لگاتار آگے اور آگے ہی بڑھتے ہوئے سفر میں ایک نقطۂ نور مہیّا کرے۔ وہ اطناب کی ایک حالت ہے' ارتکاز بالذّات کی ایک

کیفیت جس کی بدولت زندگی ہر ایسی ارتکاز کا راستہ روک لیتی ہے جس کا ہر اس عمل سے جو کسی خاص موقع پر سرزد ہوتا ہے، کوئی تعلّق نہ ہو۔ اس کے حدود بھی متعیّن نہیں کیونکہ وہ حسب اقتضاء کبھی سمٹ اور کبھی پھیل جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ شعور اعمال مادی کا ہی ایک پسِ مظہر ہے، اسکی آزادانہ فعلیت کا انکار کرنا ہے۔'' (۹)

علاّمہ شعور کو حیات کی روحانی اصل کی سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی شئے یا جوہر نہیں بلکہ تنظیمی قوّت ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مادّے کے میکانکی اعمال سے یکسر مختلف ہے۔ لیکن چونکہ شعور کی اس روحانی قوت کا اظہار محسوسات کے پس منظر میں ہوتا ہے، اس لیئے ہم محسوسات کو ہی اصل سمجھ لیتے ہیں۔

علامہ برگساں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے حیات کے تخلیقی ارتقاء کو اندھا اور بے بصر سمجھا ہے۔ برگساں کو خطرہ یہ تھا کہ ارتقاء کو غائی اور با مقصد قرار دے کر کہیں میکانیت اور جبریت جیسے نظامِ فکر میں نہ در آئے۔ اسی لیئے اس نے مستقبل کو ایک کُھلا امکان قرار دے کر ہر قسم کے مقاصد و غایات کا انکار کر دیا تھا۔ جبکہ علاّمہ کے نزدیک مقاصد و غایات ہی ہماری وارداتِ شعور کا تار و پود ہیں۔ لیکن یہ مقاصد و غایات دور کی منزلیں نہیں کہ جن کی طرف حیات کا سفر جاری و ساری ہے۔ یہ مقاصد و غایات کو شعور کے اندر مخفی و مستور ہیں اور حسبِ ضرورت انکا انکشاف و اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح علاّمہ مستقبل کو یکسر غیر متعیّن اور حیاتیاتی ارتقا کو اندھا اور بے بصر نہیں سمجھتے۔

اپنے شعوری تجربہ کا تجزیہ کر کے علاّمہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حقیقتِ مطلقہ میں مادّہ، حیات اور شعور باہم گر گھلے ملے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ علاّمہ نے مادّے کے قدیم روایتی تصوّر کو ردّ کر دیا کہ یہ کوئی ٹھوس، جامد اور غیر متحرّک مصنوع ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے جدید طبیعیات کے اس تصوّر کو قبول کیا کہ مادّہ دراصل باہم گر مربوط حوادث یعنی Interretated Events کا نظام ہے۔ اسی طرح انہوں نے حیات کی اولیّت کو تسلیم کیا اور کہا کہ کائنات کی اصل، حیات یا ارادہ ہے۔ شعور کو وہ حیات کی ہی ایک فرع اور وہ تنظیمی قوت سمجھتے ہیں جو اپنے اندر سے مقاصد و غایات کی تشکیل کرتی ہے۔ اور عمل کی راہوں کو منوّر کرتی ہے۔ اس بنا پر وہ حقیقتِ مطلقہ کو (Rationally Directed Creative Will) کہتے ہیں۔ اسے وہ انائے

مطلق (Absolute Ego) یا خدا بھی کہتے ہیں۔ خدا کو انسانی انا (Human Ego) کے حوالے سے سمجھنا ان کے نزدیک ایسے مجبوری ہے جس سے گریز محال ہے۔

☆☆☆

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی انا وجود پذیر کیسے ہوتی ہے؟ اس کا جواب علاّمہ یوں دیتے ہیں:۔

''بہرکیف میری رائے میں حقیقتِ مطلقہ کا تصوّر بطور ایک انا ہی کے کرنا چاہیئے۔ اور اس لیئے میرے نزدیک انیّتِ مطلقہ سے انیّتیں (Egos) ہی ظہور پذیر ہو سکتی ہیں یا پھر دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ انیّتِ مطلقہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار جس میں فکر کو عمل کے مترادف سمجھنا چاہیئے' ان وحدتوں کی ہی شکل میں ہوتا ہے جن کو ہم انا کی صورت میں تعبیر کرتے ہیں۔ گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلّق مادّے کی میکانکی حرکت سے ہو یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے' سب کی حقیقت ایک عظیم اور برتر انا کے انکشافِ ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہذا قدرتِ الٰہیہ کا ہر جوہر' خواہ اس کا درجہ پست ہو یا بلند اپنی ماہیّت میں ایک انا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انیت یا Ego کا اپنا ایک درجہ ہے' بڑا اور چھوٹا۔ بایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے بھی تو اس لیئے حقیقتِ مطلقہ کو انسان کی رگِ جاں سے بھی قریب تر ٹھہرایا ہے کیونکہ یہ حیاتِ الٰہیہ کا ہی سیلِ رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں''۔ (۱۰)

علامہ نے تخلیق انسان کا یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسانی انا کا ظہور' انائے اکبر یعنی ذات الٰہیہ سے ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے موتی اور پانی کی مثال دی ہے۔ قطرہ آب جب صدف میں ٹپکتا ہے تو موتی بن جاتا ہے جو اصل میں تو پانی ہی ہوتا لیکن موتی بن جانے کے بعد وہ سمندر کے پانی میں مل کر اپنی انفرادیت نہیں کھو دیتا بلکہ وہ اپنا علیٰحدہ تشخص قائم کر لیتا ہے اور پانی کے متقابل آ جاتا ہے یعنی تہی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ انسانی انا اگرچہ ذات الٰہیہ سے ہی صادر ہوتی ہے تاہم وہ اس کے اندر جذب ہو کر فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اپنی مخصوص انفرایت برقرار رکھتی ہے اس طرح انسان ذات الٰہیہ کے سیلان کے اندر موتیوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

علاّمہ کے نزدیک انسانی انا کی دو سطحیں ہیں۔ نفسِ فعاّل (Efficient Self) اور نفسِ بصیر

(Appreciative Self)۔ نفس فعال کی سطح پر انسانی انا ریاضیاتی زمان اور مادّے کے میکانکی قوانین کی سطح پر سرگرم عمل رہتی ہے جبکہ نفسِ بصیر کی سطح پر زمانِ حقیقی (Pure Duration) کے توسط سے اپنی روحانی اساس یعنی ذات الٰہیہ سے جڑ جاتی ہے۔

انسانی انا کے بارے میں علاّمہ سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر فکر و عمل کی بے پناہ قوتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر ان قوتوں کو بروئے کار لا کر اسے مستحکم اور پائیدار کر لیا جائے تو پھر موت کا صدمہ بھی اسے متاثر نہیں کر سکتا اور یہ بقائے دوام کی اہل بن جاتی ہے۔ علاّمہ نے انسانی انا کی تربیت اور اس کے استحکام پر بہت زور دیا ہے۔ لیکن معاشرے کی ضرورت و اہمیت سے تغافل نہیں برتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان نے اپنے ابتدائی دور میں ہی اپنی حفاظت اور بقا کے لئے گروہی اور معاشرتی صورت میں منظّم ہو کر رہنا سیکھ لیا تھا۔ قدیم دور کے انسان اور معاشرہ کے ربطِ باہمی کی تصویر انہوں نے رموزِ بے خودی کی ابتدائی نظم میں بڑے دلنشیں انداز میں کھینچی ہے۔

فارسی اشعار کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''کچھ معلوم نہیں کہ انسانوں میں اوّل اوّل میل جول کیونکر پیدا ہوا۔ اس کہانی کا ابتدائی رشتہ بالکل غائب ہے۔

ہم فرد کو جماعت میں دیکھتے ہیں اور باغ سے اسے پھول کی طرح چن لیتے ہیں۔

اس کی فطرت انفرادیت کی دلدادہ ہے۔ لیکن اس کی حفاظت کا تقاضا یہ ہے کہ انجمن آراستہ کر کے زندگی بسر کرے۔ یعنی بہت سے افراد مل جل کر گروہ کی صورت میں رہیں۔''

''زندگی کے میدانِ جنگ کی آگ فرد کو شاہراہ حیات میں جلا دیتی ہے۔ یعنی زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کو جدّ وجہد کرنی پڑتی ہے، وہ اتنی مصیبت خیز ہوتی ہے کہ وہ تنہا اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ معاشرے میں ہی یہ جدو جہد ممکن ہے۔

انسان اسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور موتیوں کی طرح ایک رشتے میں پروئے گئے۔

وہ زندگی کی جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جس طرح ایک پیشے کے مختلف آدمی اکٹھے مل کر کام کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اکٹھے ہو گئے۔

اس کے فکر و خیال پر دیو، پری اور بھوت پر بت چھائے ہوئے تھے اور وہ اپنے ہی اوہام سے جو چیزیں تراشتا تھا، انہی سے ڈر کر بھاگتا تھا۔

انسان کی زندگی ناپختہ تھی، اس کا میدان بہت تنگ تھا اور اسکی سوچ بچار نارسا تھی۔

جان کا خوف انسان کی آب وگل کا سرمایہ تھا۔ یعنی اس کے اجزائے ترکیبی نے خوفِ جاں کے سوا کوئی چیز پیدا نہ کی تھی۔ تیز ہوا بھی چلتی تو اس کا دل لرز جاتا۔ جو کچھ زمین سے خود بخود اُگ آتا یا اوپر سے گر پڑتا، اسی کو اٹھا کر گزارا کر لیتا، یعنی کھیتی باڑی یا کسی دوسرے ذریعہ معاش کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ جہاں کوئی چیز مل جاتی، وہ سبزی ہوتی یا کسی درخت یا جھاڑی کا پھل، اسی پر انسان قانع رہتا'' (۱۱)

مندرجہ بالا اشعار میں علامہ نے انسانی معاشرے کی بالکل ابتدائی شکل کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں معاشرتی تنظیم کا واحد محرّک غول پسندی (Gregariousness) کا جبلّی رجحان تھا۔ ایک طویل عرصہ انسان نے اسی حالت میں رہ کر اپنا اپنی بقا کی جنگ لڑی۔ پھر جب اس نے پتھر سے اوزار اور ہتھیار بنانے کا طریقہ سیکھا تو اس کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آیا۔ اب نہ صرف وہ جنگلی درندوں سے موثّر دفاع کے قابل بن گیا بلکہ مختلف جانوروں کا شکار بھی کرنے لگا۔ اس طرح شکاری معاشرے کی داغ بیل پڑی۔ پھر اس نے دیکھا کی اسکی پھینکی ہوئی گلی سڑی سبزیاں خود بخود زمین سے اُگ آتی ہیں۔ چنانچہ اب اس نے اپنی مرضی کی چیزیں اگانی شروع کر دیں۔ اسطرح زرعی معاشرے کا آغاز ہوا۔ زراعت کے ساتھ گلّہ بانی کے رجحان کو بھی فروغ ملا۔

محقّقین کہتے ہیں 1200 ق م سے کاشتکاروں اور چرواہوں کے معاشرے (Agrarian and Pastoral Society) کا آغاز ہو گیا تھا۔ کچھ کاشتکار دیہی زندگی اپنا کر ایک جگہ سکونت پذیر ہو گئے۔ اسی طرح کچھ مویشی پالنے والے اپنے گلّوں کو لے کر چراگاہوں کی تلاش میں جگہ جگہ گھومنے پھرنے لگے اور خانہ بدوش کہلائے۔ اب معاشرتی تنظیم نے قبائلی شکل اختیار کر لی۔ گروہ کے ساتھ جڑے رہنے کا لاشعوری اور جبلّی رجحان ایک واضح شعوری اور نفسیاتی احساس بن گیا جسے تاریخ میں ''قبائلی عصبیّت'' کا نام دیا گیا۔ رفتہ رفتہ بڑی بڑی آبادیاں اور قبیلے شہروں اور ملکوں کی شکل اختیار کرنے لگے اور خطہ زمین سے پیوستگی (Ethnocentrism) معاشرتی وحدت کی قوّتِ محرکہ بن گئی اور عصبیت کی بجائے حبُ الوطنی (Patriotism) کہلانے لگی۔

6000 ق م میں فنِ تحریر ایجاد ہوا جس سے ملکوں کے انتظام و انصرّام میں سرعت پیدا ہو گئی اور کئی کئی ملکوں کو فتح کر کے بڑی بڑی متمدّن سلطنتیں اور مملکتیں تشکیل دینے کا رجحان فروغ پذیر ہونے لگا۔ اب معاشرتی وحدت کو قائم رکھنے کیلئے عصبیّت اور حبّ الوطنی دونوں اصول غیر موثر ہو گئے۔ چنانچہ سماجی ہم آہنگی کو قائم رکھنے کیلئے تیسرا اصول وضع کیا گیا۔ یہ تھا تخت و تاج سے وفاداری۔ مفتوحہ ممالک کے لوگ جب ایک بڑی قلمرو اور عظیم الشان سلطنت کا حصّہ بنتے تو حلف اٹھاتے کہ وہ فاتح عالم شہنشاہ کے تخت و تاج کے وفادار رہیں گے۔ لیکن یہ نظام بھی کارآمد ثابت نہ ہو سکا۔ تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جہاں کہیں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں، وہاں جلد یا بدیر بغاوتوں، شورشوں اور خانہ جنگوں کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھانت بھانت کے خطوں اور مختلف رنگ و نسل کی قومیتوں کو ایک سماجی وحدت میں پرونا اور انہیں ایک پرچم تلے منظّم کرنا ناممکن تھا۔

علامہ اقبال اپنے چھٹے خطبہ میں شہنشاہ جولین کی مثال دیتے ہیں جو اپنی عظیم الشان ایمپائر کے سیاسی و سماجی اتحاد کو برقرار رکھنے کیلئے کسی موثر اصول کی تلاش میں مسیحیت کی طرف راغب ہوا، لیکن جلد ہی اسکی راہبانہ تعلیمات سے دل برداشتہ ہو کر قدیم رومی دیوتاؤں کی طرف لوٹ گیا۔

اس دور کی متمدن دنیا کا نقشہ مشہور مورخ ڈینی سن (Denison) نے اپنی کتاب Emotion as Basic of Civilization میں بڑے موثر انداز میں کھینچا ہے۔ علامہ نے اس کتاب سے ایک اقتباس اپنے چھٹے لیکچر میں پیش کیا ہے جو کچھ یوں ہے:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان تمدن جس کی تعمیر میں چار ہزار برس صرف ہوئے، انتشار اور تباہی کے کنارے آلگا ہے۔ لہذا ڈر تھا کہ انسان پھر کہیں وحشت اور بربریت کی اس زندگی کا شکار نہ ہو جائے جس میں ہر قبیلہ اور ہر فرقہ دوسرے قبیلے اور فرقے سے دست و گریبان رہتا تھا اور جس میں نہ کہیں قانون کا تصوّر تھا' نہ نظم و نسق کا۔ قبائلی زندگی کی بنیاد جن sanctions پر تھی۔ ان میں اب کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ اور اس لیئے وہ پرانے طور طریقے بھی جن سے اس وقت سلطنتیں کام لے رہی تھیں بے کار اور فرسودہ ہو چکے تھے۔ رہیں وہ sanctions جو انکی جگہ عیسائیت نے قائم کیں' سو وہ نظم اور اتحاد کی بجائے اور زیادہ افتراق' ہلاکت اور تباہی پھیلا رہی تھیں۔ یہ زمانہ بڑا پر آشوب اور خطرناک تھا۔ تہذیب و تمدّن کا شجرِ عظیم جس کے برگ و بار اطراف و اکنافِ عالم میں پھیل گئے تھے اور جس کی

شاکوں پر کبھی علم وفن اور ادب کے ثمر ہائے زرّیں لگے تھے' بوسیدہ ہو رہا تھا۔ اسکے رگ و پے میں عقیدت واحترام کا رس ہی باقی نہ رہا تھا کہ اس کی قائم اور برقرار رہتی۔ برعکس اس کے جنگ وجدال کی آندھیوں نے جو آئے دن اٹھتی رہتی تھیں' اسکی جڑیں کھوکھلی کر رکھی تھیں۔ اس کا وجود قائم تھا تو صرف عہدِ قدیم کے رسوم ورواج کہ اس زمانے میں کیا کوئی ایسی تہذیب بھی موجود تھی جس کی بنا محض جذبات پر ہوتی۔ اور جس سے بنی نوعِ انسان میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ ساتھ عالمی تہذیب کا کہیں وجود ہوتا تو اس کی نوعیت یکسر مختلف ہوتی۔ یہ اس لیئے کہ قدیم متمدّن دنیا کی (sanctions) اور رسوم وظواہر پیدا کیئے جاتے تو اس کے لیئے صدیوں کی ضرورت ہوتی۔'' (۱۲)

ڈینی سن نے کھلے الفاظ میں یہ اقرار کیا ہے کہ سماجی تنظیم کے وہ تمام اصول عصبیّت' زبان کی برتری' رنگ ونسل کا تفاخر' حُبّ الوطنی' تخت وتاج سے وفاداری وغیرہ تمام ناکارہ اور بے کار ہو چکے تھے۔ کوئی ایسی ارتباطی قوّت اتنی موثّر اور کارآمد نہیں رہ گئی تھی جو معاشرے کے تمدّنی وثقافتی ڈھانچے کو سہارا دے کر کھڑا رکھ سکتی۔ یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ کہیں جنگ وجدل کے مسلسل بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پوری نسلِ انسانی ہی نا جل کر راکھ ہو جائے۔ پھر وہ اس بات پر تعجّب کا اظہار کرتا ہے کہ ان حالات میں اسلام کی آمد ہوتی ہے جب اسکی اشد ضرورت تھی اور جو انسانیت کو ایک نیا معاشرتی آئیڈیل اور سماجی تنظیم کا ایک نیا اصول فراہم کرتا ہے جو لوگوں کے روحانی تقاضوں اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بنیادی اصول توحید یعنی سلاطین وملوک کی بجائے ایک اللہ کی اطاعت وہ اخلاقی اور روحانی اساس ہے جس پر نہ صرف اعلٰی درجے کی انسانی شخصیت تعمیر ہوتی ہے بلکہ ایک بہترین انسانی معاشرہ بھی استوار ہوتا ہے۔ تاریخ وتمدّن کے موّرخینِ اس امر کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ صدرِ اسلام کا معاشہ تاریخِ عالم میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چند صدیوں معد ہے اس زرّیں اصول کو فراموش کر دیا گیا اور دنیا جہان کی برائیاں اسلامی معاشرے میں در آئیں۔ زوال وانحطاط کی سیاہ رات صدہوں تک مسلمان پر چھائی رہی۔ بڑے بڑے قومی المیے اور اجتماعی سانحے بھی انہیں انکے خوابِ گراں سے بیدار نہ کر سکے۔

مسلمانوں کو جگانے اور اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ پانے کیلیے علاّمہ اقبال نے انفرادی شخصیت کی تشکیل اور پورے معاشرے کی تعمیر خالصتہً اسلامی خطوط پر کرنے کیلیئے اپنی دو شاہکار کتابوں ''اسرارِ خودی'' اور

''رموزِ بیخودی'' میں پورا لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ وہ ان روحانی اور اخلاقی اقدار و فضائل کی تشریح کرتے ہیں جو تصوّرِ توحید سے متفرّع ہوتی ہیں اور انہیں انسانی شخصیت اور انسانی معاشرے دونوں میں جاری وساری کرنے کی تعلیم دیتے ہیں؟ علاّمہ نے استحکام خودی اور تعمیر سیرت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے لیئے استحکامِ خودی فی نفسہ مقصود نہیں وہ استحکامِ خودی کے بعد اسے معاشرے میں ضم کر دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ مسلمان معاشرے یا ملتِ اسلامی ہی کے اپنے کچھ اہداف و مقاصد ہوتے ہیں جو انفرادی کرداروں سے بالاتر اور وقیع تر ہوتے ہیں اور بعض حالات میں انفرادی اناؤں سے متعارض بھی ہو جاتے ہیں۔ انفرادی انا کا مقصود ایک ہی ہے کہ وہ تربیت اور استحکام کے بعد خود کو معاشرتی وحدت میں گم کر دے۔ ملّت یا معاشرہ میں انجزاب انفرادی انا کے ارتقاء اور بقا کی پہلی اور آخری شرط ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علاّمہ کے نزدیک معاشرہ افراد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

علاّمہ اقبال مسلم معاشرے کے زوال و انحطاط سے بہت رنجیدہ و غمزدہ ہوتے تھے لیکن وہ اسکی نشأۃِ ثانیہ کے امکان سے کبھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کی تمام صلاحیتیں مسلمان معاشرے کی اصلاحِ احوال کیلیئے وقت کر رکھی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے اردگرد غفلت، بے حسی اور تباہی کے مناظر دیکھ کر زیادہ ہی غمزدہ ہو جاتے۔ ایسے میں ان کا شاعرانہ وجدان انہیں دور کسی اور ہی جہاں میں لے جاتا ہے۔ جاوید نامہ میں انہوں نے اپنی سیرِ افلاک اور روحانی سفر کے احوال بیان کیے ہیں۔ اپنے اس سفر کے دوران جب وہ سیارہ مریخ پر پہنچتے ہیں تو وہاں انکے مشاہدے میں ایسا معاشرہ آتا ہے جو انکی امنگوں اور آرزؤں کی تصویر ہے۔ یہاں علاّمہ کے اس یوٹوپیا کا مختصر ذکر یقیناً دلچسپ ثابت ہوگا۔

علاّمہ اپنے روحانی سفر میں فلک قمر، فلک عطارد اور فلک زہرہ سے ہوتے ہوئے فلک مریخ پر پہنچتے ہیں۔ رومی ان کے ساتھ ہیں۔ اور علاّمہ خود کو ''زندہ رود'' کہتے ہیں۔ یہاں ایک مرغزار میں انہیں ایک رصدگاہ نظر آتی ہے۔ رومی زندہ رُود کو بتاتے ہیں کہ یہ مقام زمین کے مماثلت رکھتا ہے اور یہاں کے باشندے کرۂ ارض کی

بستیوں کی طرح ہی گلی کوچوں میں رہتے ہیں اور مغربی اقوام کی طرح ہی علوم وفنون کے ماہر ہیں۔علم و ہنر میں وہ اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ زمان ومکان پر غالب آ چکے ہیں۔ یہاں موت جسم کے مرنے سے وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ان کوقبل از وقت اپنی موت کا علم ہو جاتا ہے اور یہ جسم کو روح کے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ابھی رومی اور زندہ رود یہ باتیں کر ہی رہے ہوتے ہیں کہ رصدگاہ سے ایک طویل القامت اور عمر رسیدہ مریخی عالم برآمد ہوتا ہے۔اس کی داڑھی برف کی طرح سفید ہے اور وہ زمینی سائنسدانوں کی طرح بڑا دانا و بینا نظر آتا ہے۔اس کا چہرہ ترکوں کی طرح ہے اور آنکھوں میں گہرے غور وفکر کے آثار ہیں۔

بوڑھا مریخی رومی اور زندہ رود کو وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور انہیں طوسی اور خیام کی زبان میں خوش آمدید کہہ کر وہاں کے حالات بیان کرتا ہے۔زندہ رود اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ وہ فارسی زبان کیسے بول رہا ہے اس پر بوڑھا مریخی بتاتا ہے کہ وہ ایران میں رہ چکا ہے۔پھر وہ کہتا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے زمانے میں ایک مریخی زمین پر گر گیا تھا اور اس نے اپنی یادداشت میں زمین کے احوال قلمبند کئے تھے۔خود اپنے بارے میں وہ پیرِ مریخی ان کو بتاتا ہے کہ وہ معدنی تحقیقات کے سلسلے میں ایران، یورپ، مصر، ہند، امریکہ، چین اور جاپان کی سیر کر چکا ہے۔لہٰذا اہل زمین مریخ والوں سے واقف ہوں یا نہ ہوں، مریخی، زمین والوں کو خوب جانتے ہیں۔

مریخی دانشمند کی باتیں سن کر اپنا اور زندہ رود کا تعارف کراتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی تحقیق ہے۔

مریخی دانشمند انہیں بتاتا ہے کہ وہ جہاں کھڑے ہیں ہو وہاں کے ابوالآباء برخیا کے آباد کیئے ہوئے شہر مرغدین کا نواح ہے۔ برخیا اللہ کا بڑا نیک بندہ تھا اس ئے وہ بہشت میں فرزمرش (یعنی ابلیس) کے بہکاوے میں نہیں آیا۔اس لیئے اللہ نے اسے مریخ کا یہ جنت نظیر فلک عطا کیا۔

اس کے بعد رومی اور زندہ رود شہر مرغدین کی سیر کرتے ہیں اور اس کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں:

مرغدین شہر کی عمارتیں بلند و بالا ہیں۔ یہاں کے رہنے والے خوش گفتار، خوش شکل، نرم خو اور سادہ پوش

ہیں۔انہیں وہاں روزی کمانے کی فکر ہلکان نہیں کرتی۔وہ کیمیائے آفتاب کے زاردان ہیں۔جس طرح اہلِ زمین آب شور سے نمک حاصل کر لیتے ہیں ویسے ہی وہ سورج کی شعاعوں سے سیم وزرکشید کر لیتے ہیں۔وہاں علم و نہر کا مقصد خدمت ہے اور کارگردگی جانچنے کا پیمانہ زر نہیں، وہاں کوئی دینار و درہم سے آشنا نہیں، یہ بت وہاں کے حرموں میں نہیں پائے جاتے۔مشینوں کا شور طبیعتوں پر گرانبار نہیں، نہ ہی وہاں کا آسماں فیکٹریوں اور ملوں کے دھوئیں سے تیرہ و تاریک ہے۔وہاں کے کسان محنتی ہیں،ان کے چراغ روشن رہتے ہیں۔اور وہ جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہتے ہیں۔یہاں کے لوگ کاشتکاری کرتے ہیں۔لیکن اتنے اجڈ اور گنوار نہیں کہ پانی کیلئے ایک دوسرے کے گلے کاٹیں۔یہاں ہر کاشتکار کو اپنے کام کا پورا صلہ ملتا ہے۔(کیونکہ جاگیرداری نظام یہاں سرے سے موجود ہی نہیں)۔یہان نہ فوج ہے نہ پولیس، نہ یہاں کشت وخون ہوتا ہے، نہ یہاں تشہیر و دروغ یعنی پروپیگنڈا کی کوئی صورت پائی جاتی ہے۔نہ یہاں کے بازاروں میں آوارہ اور بے کار لوگوں کی بھیڑ بھاڑ ہے اور نہ ہی بھیک منگوں کی صدائیں سمع خراشی کرتی ہیں۔حکیمِ مریخی زندہ رود کو بتاتا ہے کہ یہاں کوئی نہ سائل ہے نہ مفلس، نہ حاکم ہے، نہ محکوم۔نہ آقا ہے، نہ کوئی غلام، سب بھائی بھائی ہیں۔

حکیم مریخی رومی اور زندہ رود کو مرغدین کی سیر کرا رہے تھے کہ اچانک ایک کھلے میدان میں انہیں ایک مجمع نظر آیا۔جس سے ایک عورت خطاب کر رہی تھی۔اس کا چہرہ بظاہر خوب چمکتا تھا لیکن اس کا دل سوز و گداز سے محروم تھا۔اس کا سینہ جوش جوانی سے خالی تھا اور وہ عشق اور آئین عشق سے بے خبر تھی۔وہ مرد وزن کے باہمی تعلقات پر تقریر کر رہی تھی، یعنی ''اسرار بدن'' فاش کر رہی تھی اسکی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کو ازدواج سے بچنا چاہیے تاکہ وہ بارِ امومت اور پرورشِ اطفال کی زحمت سے بچی رہیں۔حکیم مریخی زندہ رود کو بتاتا ہے کہ یہ دوشیزہ مریخی نہیں بلکہ اسے فرزمرز یعنی ابلیس یورپ سے اٹھالایا ہے۔یہ فرنگن خود کو نبیۂ آخر الزماں کہتی ہے اور لوگوں کو بہکاتی ہے۔''

بعض لوگ علامہ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ سائنسی ترقی کے مخالف ہیں اور انسانیت کو قرون اولیٰ کی طرف دھکیلنا چاہیے۔یہ الزام سراسر غلط اور تعصب پر مبنی ہے۔اپنی تحریروں اور شعروں میں وہ جگہ جگہ سائنس کے اہم

کردار کا اعتراف کرتے ہیں۔ شہر مرغدین کے لوگوں کی سائنسی ترقی اور رصدگاہ کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ وہ دور دراز کی کہکشاؤں پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ سائنسی ترقی کے کتنے حامی تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ سائنس اخلاقی فضائل اور روحانی و اخلاقی اقدار کا درس نہیں دے سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ سائنسی ترقی کیلئے حدود و قیود کا تعین کیا جائے۔ سائنس تو آپ کو بندوق بنا دے گی۔ اب آپ چاہیں تو اسے کسی جنگلی جانور پر چلائیں۔ اپنے تحفظ کے لئے استعمال کریں یا اس سے خودکشی کر لیں۔ سائنسی ترقی جب تک اخلاقی اور روحانی اقدار کے ساتھ مکمل طور پر آہنگ نہ ہو جائے انسانیت کے سر پر ہلاکت و بربادی کے سائے منڈلاتے رہیں گے۔ علامہ اقبال اگر صدر اسلام کے معاشرتی فضائل اور اخلاقی اقدار کی تعریف کرتے ہیں تو انہیں قرونِ اولیٰ کی طرف مراجعت کا طعنہ دینا قطعاً درست نہیں۔

علامہ اقبال اس بات کے بالکل قائل نہیں کہ نیابت الٰہیہ کا خدائی منصوبہ صرف امت مسلمہ ہی پورا کر سکتی ہے۔ وہ بار بار مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنے فکر و عمل کی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا مقدر بدل ڈالیں ورنہ شاید ان کی داستان تک نہ ہو داستانوں میں اور ان کا معاشرتی تار و پود یوں بکھر جائے جس طرح اندلس کی سرزمین سے مسلمانوں کا عظیم الشان تمدن ذرّاتِ خاک بن کر بکھر گیا تھا۔

علامہ اقبال پوری انسانیت کے مفکر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمام انسانیت امن، سلامتی اور ترقی کا نمونہ بن جائے۔ وہ یقین رکھتے ہیں اگر امت مسلمہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہی تو دنیا کی امامت کا فریضہ کسی دوسری قوم کو سونپ دیا جائے گا کیونکہ وحدت بشری اور نیابت الٰہیہ کا منصوبہ بہرحال کامیاب ہونا ہے۔ (۱۳)

علامہ نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفے کا اجمالی خاکہ پیش کیا تھا۔ اسکے آخر میں وہ بڑے موثر انداز میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ علامہ لکھتے ہیں:

> ''نیابت الٰہی دنیا میں انسانی ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں یہ خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے وہ حیات

کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔بعینہ اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے۔اس کی زندگی میں فکر اور عمل، جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا، اس لئے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائے منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں، برمحل ہیں۔اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں افراد کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے۔ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور سکا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا تھا۔‘‘(۱۴)

انسانیت کے اس بلند ترین مقام تک پہنچنے کی اس آرزو کی صدائے بازگشت علامہ کہ ان اشعار میں سنائی دیتی ہے۔

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدہ امکاں بیا
شورش اقوام را خاموش کن
نغمہ خود را بہشت گوش کن

حوالے اور حواشی

1 Feris Timithy, "Coming of Age in the Milky Way" Affiliated East West Press Private Ltd, New Delhi, 1988 p.414

2 مرتضیٰ احمد خاں، ''تاریخ اقوام عالم'' مجلس ترقی ادب۔۲ نرسنگھ داس گارڈن روڈ لاہور۔ص ص ۳۶-۳۷

3 انسان کی پیدائش کی ابتداء کے بارے میں چند مزید قرآنی حوالے درج ذیل ہیں:-

العلق(96:2)،الحج(22:5)،الطارق(86:5)،الصّافات (37:11)،الکہف (18:38)،المومنون(23:12)

4 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد اول ۲۰۰۱ء ص 64

5 اقبال، ''تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' (ترجمہ: نذیر نیازی) بزم اقبال کلب روڈ لاہور ۱۹۵۸ء ص 124

6 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد اول ص 24

7 اقبال کتاب مذکور ص 128

8 ایضاً ص 62

9 〃 ص 84

10 〃 ص 110

11 پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح رموزِ بیخودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۳ء ص 44

12 اقبال، کتاب مذکور ص ص ۲۶۵-۲۲۶

13 نعیم احمد ڈاکٹر، ''فلسفے کی ماہیت'' ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۷ء ص 217

14 چشتی، محمد یوسف خاں پروفیسر، شرح اسرارِ خودی، اقبال اکیڈیمی تاج پورہ لاہور ص 15-16